ترجمہ و تلخیص: ثاقب اکبر

دورِ حاضر کا علم کلام

"علم الکلام المعاصر" حیدر حب اللہ کی کتاب ہے جو ۱۴۲۳ھ میں المرکز العالمی للدراسات الاسلامیہ، قم، ایران نے پہلی مرتبہ شائع کی ہے۔ حیدر حب اللہ کا تعلق لبنان سے ہے۔ ان سطور میں کتاب ھذا کا مختصر تعارف اور خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

"علم الکلام المعاصر" نے جدید علم کلام کے مطالعے میں ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ خاص طور پر اس لحاظ سے بھی کہ اس میں ایران و عراق کے علاوہ لبنان میں کلام جدید کے حوالے سے ہونے والے کام کے ایک اہم حصے کا تعارف بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اردو قارئین تاحال عراق و لبنان میں معاصر اسلامی فکر کے بارے میں ہونے والے کام سے بہت کم آگاہ ہیں۔ جسے اس ضمن میں ایک ابتدائی قدم سمجھا جانا چاہیے۔ کتاب چھ صفحات کے ایک مختصر مقدمے اور چھ فصول پر مشتمل ہے۔

مقدمہ

مقدمے میں مصنف محترم کہتے ہیں کہ علم کلام ارتقاء، تغیر اور تکامل کے مختلف ادوار سے گزر رہا ہے اور تمام علوم کو اونچ نیچ کے ایسے مراحل ضرور پیش آتے ہیں۔ معاصر علم کلام کا آغاز تقریباً جمال الدین افغانی سے ہوتا ہے۔ اس وقت سے یہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اس علم نے نہ صرف دینی افکار کو متاثر کیا ہے بلکہ موجودہ سیاسی افکار پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔ عالم اسلام میں استعماری قوتوں کے خلاف آزادی کی تحریکوں کے دوران میں یہ پروان چڑھا اور اس میں وسعت اور گہرائی آتی گئی۔ تاہم اس کے زوایا، مناہج اور افکار مختلف تھے۔ جدید علم کلام کے حوالے سے اگرچہ جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، محمد رشید رضا، علامہ محمد حسین طباطبائی، شہید محمد باقر الصدر، اقبال لاہوری، علی شریعتی، عبدالکریم سروش، محمد ارکون، حسن حنفی، شہید مطہری وغیرہ جیسی تمام شخصیات کا کردار اہم اور قابل ذکر ہے تاہم اس کتاب میں تین ملکوں سے ایک ایک نمائندہ شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے تاکہ ان مختلف مسلمان قوموں کے جدید علم کے بارے میں متنوع تجربات سامنے آجائیں اور ان کا تقابلی جائزہ لے کر کلام جدید کے مستقبل کے حوالے سے کچھ نتائج اخذ کئے جاسکیں۔ ایران سے علامہ سید محمد حسین طباطبائی، عراق سے سید محمد باقر الصدر اور لبنان سے سید محمد حسین فضل اللہ کا انتخاب کیا گیا ہے اور ان کے افکار کا مثبت طریقے سے جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخِ کلام کے مطالعے کی اہمیت

مجموعی طور پر یہ فصل کلام جدید یا کلام معاصر کے بنیادی موضوع سے متعلق نہیں ہے۔ جزوی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جیسے دیگر علوم کی تاریخ اور ارتقائی مراحل کا مطالعہ قاری کے لئے مفید ہوتا ہے اسی طرح علم کلام کے بارے میں بھی یہ جاننا مفید ہے کہ ابتدائی طور پر اس کے موضوعات کیا تھے، مختلف ادوار میں اس کے کون کون سے قابل ذکر مکاتب فکر رہے ہیں اور کن مراحل سے گزرتے ہوئے آج یہ علم جدید دور میں داخل ہوا ہے۔

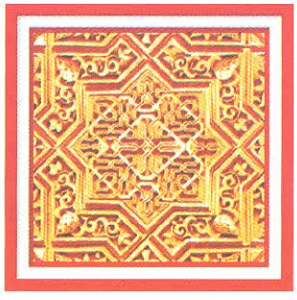

اس فصل میں مصنف محترم کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ افکار ونظریات کی حقیقت اور درستی کو جاننے کے لئے تاریخ علوم نے ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ انسانی معرفت وعلم کو تحقیقی وتاریخی طور پر جاننے کے لئے اسے ایک اہم فکری کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے عموماً کسی علم میں موجود درستی و نادرستی کے عناصر سامنے آتے ہیں۔ یہی حال علم کلام کا بھی ہے جو دینی علوم میں سے شمار ہوتا ہے۔

اسلامی قرون وسطیٰ میں تاریخ علوم

مسلمان علماء کے مابین تاریخ علم کی کسی نہ کسی درجے پر اہمیت رہی ہے۔ انھوں نے ماقبل کے علماء کے افکار ونظریات کے بارے میں تحقیق کی۔ وہ اُن کی آراء جاننے میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اگرچہ اُن کی مساعی تاریخ علم کی عصری صورت تک نہ پہنچی ہوں۔ بطور مثال اسلامی کلام وعقائد پر نوبختی (م۳۰۰ھ) اور شہرستانی (۵۴۸ھ) وغیرہ نے کام کیا ہے۔ انھوں نے مختلف فرق، مذاہب اور گروہوں کے بارے میں عمیق تاریخی اور علمی کام کیا ہے۔ علاوہ ازیں بلخی، ابی الحسن الاشعری (۳۲۵ھ)، شیخ مفید (م۴۱۳ھ)، عبدالقاہر بغدادی (م۴۲۹ھ)، ابن حزم ظاہری (م۴۵۶ھ)، ابوبکر باقلانی وغیرہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ معاصرین میں سے شیخ جعفر سبحانی اور ڈاکٹر محمد جواد مشکور نے اس حوالے سے قابل ذکر کام کیا ہے۔

فقہی حوالے سے بھی اس سلسلے میں کوششیں کی گئی ہیں۔ محمد جواد العاملی (م۱۲۲۶ھ) کی کتاب مفتاح الکرامۃ اس کی ایک مثال ہے۔ ان کی تاثیر شیخ محمد حسن نجفی (م۱۲۶۶ھ) کی جواہر الکلام، سید محسن الحکیم (م۱۳۹۰ھ) کی مستمسک العروۃ اور شیخ انصاری (م۱۲۸۱ھ) کی ''مکاسب'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علم اصول میں شیخ مرتضیٰ انصاری کی کتاب ''فرائد الاصول'' میں بہت سے اصولی علماء کی آراء دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح تفسیر اور قرآنیات کے باب میں طبرسی کی مجمع البیان اور طوسی کی تبیان میں بہت سی تفسیری آراء نقل کی گئی ہیں اور ان میں سے بہت سوں کی تائید بھی کی گئی ہے۔ ایسی ہی مثالیں فلسفہ اور دیگر علوم کی کتابوں میں موجود ہیں۔ متاخرین اور معاصرین نے اس ضمن میں خاصا وقیع کام کیا ہے۔

دینی علم کی تاریخ کے فوائد

کسی دینی علم کی تاریخ کے بہت سے فوائد ہیں۔ ان فوائد کو علم کلام کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً:

(۱) کسی علم کی تاریخ کے مطالعے سے خود اس کی حقیقت اور اُس میں زیر بحث آنے والے نظریات کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔ آج اور گذشتہ کا کوئی بھی نظریہ جن مراحل سے گزر کر تشکیل پایا ہے، اس کی تاریخ ہی کے مطالعے سے سمجھ میں آتا ہے۔

(۲) اس مطالعے سے لفظی نزاعات سمجھ میں آجاتے ہیں اور اصطلاحات واضح ہو جاتی ہیں۔ گاہے کوئی شخص تصور کرتا ہے کہ زیر بحث اصطلاح دو مختلف زمانوں میں ایک ہی معنی پر دلالت کرتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ تاریخ علم کے مطالعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی اصطلاح کس سیاق اور کس پس منظر میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ مثلاً شیعہ علم کلام میں ولایت تکوینی کی اصطلاح مختلف مفاہیم میں مستعمل رہی ہے۔ اجتہاد کی اصطلاح بھی اسی طرح مختلف معانی میں بروئے کار لائی جاتی رہی ہے۔

(۳) اس مطالعے سے مختلف علوم کے باہمی ارتباط کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً علم کلام کی تاریخ کا مطالعہ فلسفے سے اس کے تعلق کا پتہ دیتا ہے۔ نصیر الدین طوسی (م۶۷۲ھ) اور فخر الدین رازی (م۶۰۶ھ) سے ماقبل ان دونوں علوم کے مابین مخاصمت رہی ہے۔ فقہ واصول کا بھی مثبت ومنفی رابطہ منطق وفلسفہ سے رہا ہے۔ ایسے ایجابی وسلبی تعلقات مختلف علوم کے مابین مختلف ادوار میں رہے ہیں۔

معاصر علم کلام کا آغاز تقریباً جمال الدین افغانی سے ہوتا ہے۔اس وقت سے یہ ترقی کی منازل طے کررہا ہے۔ اس علم نے نہ صرف دینی افکار کو متاثر کیا ہے بلکہ موجودہ سیاسی افکار پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔

علامہ طباطبائی

(۴) اس مطالعے سے ایک یا مختلف علوم میں موجود رہنے والے نظریات کے مختلف ادوار کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک دور میں عرفانی انسان کامل کے نظریے کا شیعہ علم کلام سے ایک خاص تعلق رہا ہے۔ حضرت ابوحنیفہ (م ۱۵۰ھ) کا سنت نبوی کے بارے میں اور سید مرتضٰی وابن ادریس کا خبر واحد کی حجیت کے بارے میں ایک خاص نظریہ رہا ہے۔

(۵) بعض افکار علمی مخطوطات میں مدفون ہوتے ہیں۔ کسی تاریخ کے علم کے مطالعے سے ان مدفون افکار کی قیمت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً علم کلام میں بھی ابی الصلاح اور ابن زہرہ جیسی شخصیات کے کلامی نظریات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

(۶) کسی علم کی مطالعہ ہمیں ان اسباب سے آگاہ کرتا ہے جو اُس کے عروج وزوال کا باعث ہوئے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ شیخ طوسی کے وفات کے بعد ان کی عظمت کی وجہ سے کلام، اصول اور فقہ میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

(۷) علمی شخصیات کی حقیقی معرفت میں بھی یہ علم مدد دیتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کسی شخصیت نے کسی علم کی ترقی اور تعارف کے لئے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس سے اُن کامیابیوں اور مشکلات کا پتہ چلتا ہے جو ان شخصیات کے حصے میں آئیں۔

(۸) اس سے خارجی لحاظ سے بھی کسی تجربے کا مطالعہ ہو جاتا ہے اور یہ ایک اہم نقطہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال کلام جدید کا وہ مقابلہ ہے جو اُس نے مارکسزم کے ساتھ کیا ہے جس کا آغاز تقریباً بیسویں صدی کی ابتدا سے ہوا اور جو اسی کی دہائی کے آخر تک جاری رہا۔

علامہ طباطبائی کا کلامی تجربہ

علامہ سید محمد حسین طباطبائی جیسی عظیم شخصیت کے کلامی نظریات کا مطالعہ فلسفے اور قرآن کے حوالے سے اُن کے مطالعے کے بغیر میسر نہیں۔ اُن کے فلسفی عرفانی پہلو نے اُنکے علم کلام پر اثرات مرتب کئے ہیں۔ یہی حال اُن کے قرآنی پہلو کا بھی ہے۔

علامہ طباطبائی کو عام طور پر نظری وعملی اعتبار سے شیعی فکر میں تبدیلی کے حوالے سے ایک اہم شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ بیشتر جدید فلسفی وتفسیری مکاتب فکر نے انہی سے نمو پائی ہے۔ اُن کے مدرسہ علمی نے عصر حاضر کے بعض اہم علماء پیدا کئے ہیں۔ استاد شہید مرتضٰی مطہری، علامہ جوادی آملی اور مصباح یزدی جیسے مفسرین وفلاسفہ اس کی مثال ہیں۔ عرفانی شخصیات میں بھی اُن کا مقام بہت بلند ہے۔

> بعض محدثین نے علم کلام میں نص کی بنیادی اہمیت پر زور دینے کے لئے اُن نصوص کی جمع و ترتیب کا کام کیا جن کا تعلق کلامی موضوعات سے ہے۔

ان کے منہج کلامی کے حوالے سے مصنف محترم نے مختلف پہلوؤں پر بات کی ہے۔ اس سلسلے میں علم کلام میں عقل یا نص کی حیثیت کے حوالے سے متکلمین نے نزاع کا بھی ذکر کیا ہے اور پھر اس میں علامہ کے نظریے کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اجماع اور کلام وعرفان کے باہمی تعلق جیسے موضوعات کا بھی ذکر کیا ہے ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

کسی فلسفی کے لئے نص کا معاملہ اہم مشکلات میں سے ہے۔ گذشتہ دور کا متکلم ہمیشہ نص کو بنیادی اہمیت دیتا تھا اور کسی نہ کسی طریقے سے اُس سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا لہٰذا گذشتہ دور کی علم کلام کی تعریفیں بھی اسی امر کی حکایت کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ تعریفیں ایسی قیود پر مشتمل ہیں جن کا مقصد کلام کو نص دینی سے ہم آہنگ کرنا ہے مثلاً ''شریعت سے موافقت'' کی شرط یا دینی عقائد کا اثبات اور ان کے بارے میں شبہات کا ازالہ یا اسلاف یا اہل سنت سے منحرف بدعتیوں کے عقائد کا رد یا شرعی عقائد کے قواعد کا علم یا ذات باری، اس کی صفات وغیرہ۔ ایسی قیود نے علم کلام کو فلسفے سے الگ کر دیا کیونکہ اُس کی بنیاد برہان ہے۔ اس میں نصیر الدین طوسی اور فخر الدین رازی کے زمانے سے لے کر صدر المتالہین شیرازی کے دور تک یہ قضیہ مختلف رہا۔ اس دور میں فلسفی وکلامی منہج میں قربت دکھائی دیتی ہے۔ تاہم حالیہ صدیوں میں عالم اسلام میں فقہ وحدیث جیسے نقلی علوم نے نمو حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں شیعوں میں اخباری مسلک اور سنیوں میں وہابی تحریک نے فروغ پایا۔ اس دور میں نص کی اہمیت ایک شدید قوت کے ساتھ لوٹ

آئی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ پھر علوم عقلی کو علوم نقلی پر سبقت حاصل ہوگئی اور علم اصول الفقہ میں بھی اُسے دسترس حاصل ہوگئی۔علم کلام میں بھی گذشتہ صدی میں تبدیلی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔نص کی مرجعیت کے اثرات اہم متکلم وفقیہ شیخ کاشف الغطا کے ہاں بھی موجود ہیں، اگر چہ وہ منہج عقلی سے متاثر تھے۔بعض محدثین نے علم کلام میں نص کی بنیادی اہمیت پر زور دینے کے لئے اُن نصوص کی جمع وترتیب کا کام کیا جن کا تعلق کلامی موضوعات سے ہے۔اس سلسلے میں متعدد مجموعے مرتب ہوئے۔شیخ محمد بن حسن حر العاملی کی کتاب ''اثبات الهداة بالنصوص و المعجزات'' اس کی ایک مثال ہے۔

علامہ طباطبائی کا اس سلسلے میں واضح نظریہ یہ ہے کہ علم کلام کے موضوعات میں عقل کو غیر متنازع طور پر اولین بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اور متکلمین نے ''موافقة الشرع'' جیسی جو عبارات اختیار کی ہیں وہ خطا پر مبنی ہیں۔گویا وہ کلام میں مرکزیت عقل کے قائل ہیں نہ کہ مرکزیت عقیدہ کے۔

اس سلسلے میں اگر علامہ طباطبائی کی تفسیر المیزان پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ وہ اپنی تفسیری بحث میں نص کو نہیں لے کر آتے بلکہ جب کسی آیت یا آیات کی تفسیر اپنے خاص علمی طریقے سے مکمل کر لیتے ہیں تو پھر متعلقہ نصوص اور روایات کو لے کر آتے ہیں۔ان میں وہ نصوص بھی شامل ہیں جنھیں شان نزول، اسباب النزول یا تفسیری نصوص کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں وہ ملاّ صدرا کے مکتب سے وابستہ دکھائی دیتے ہیں جو ''اصالة العقل'' پر ایمان رکھنے والوں میں سے تھے اور علم کلام میں بھی انھوں نے اسی اصول کو جاری کیا۔ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اس علم کو جدلی دائرے سے نکال کر فلسفی و برہانی راستے پر ڈال دیا جائے۔

علامہ طباطبائی اجماع کو بھی کلامی موضوعات میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔یہی وجہ ہے کہ تفسیر المیزان میں کلامی موضوعات میں انھوں نے کہیں بھی اجماع سے استفادہ نہیں کیا جبکہ اکثر کلامی بلکہ گاہے غیر کلامی موضوعات میں بھی انھوں نے فلسفی روش ہی کو اپنایا ہے۔مختلف مقامات پر انھوں نے اجماع کے حوالے سے جو بحث کی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اُسے ظنی حجت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، وہ بھی اجماع امت کے نظریے سے نسبتاً تنگ دائرے میں، جبکہ کلامی موضوعات مین ظنی حجت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

جہاں تک عرفان وکلام کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے، بنیادی طور پر منہج عرفانی قلب وشہود سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی معرفت ہمارے علوم سے مختلف نوعیت کی ہے۔عارف لغت وکلمات سے ہٹ کر کشف حقائق کے درپے ہوتا ہے لیکن جیسا کہ استاد مرتضیٰ مطہری کا کہنا ہے کہ صدر المتالہین نے فلسفی عقل سے وہی نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے جو عرفا قلوب کے ذریعے سے کرتے ہیں۔علامہ طباطبائی نے بھی جو ملا صدرا کے مکتب سے تعلق رکھتے ہیں، یہی کام کیا ہے۔جب ہم اُن کے عرفان و کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ عرفانی موضوعات کا علمی ونظری طریقے سے اثبات کرتے ہیں۔

شہید سید باقر الصدر کا کلامی تجربہ

عام طور پر کسی ایک دور میں مفکرین کی توجہ کسی ایک مرکزی نقطے پر مرتکز رہتی ہے۔شہید سید محمد باقر الصدر کا زمانہ فکر و

ثقافت کے انقلاب کا زمانہ تھا۔ بیسویں صدی کے بیشتر مسلمان مفکرین کی کوششیں اسی سے متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ شہید صدر کے کلامی منہج کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

شہید باقر الصدر

۱. علم معرفت کے جدید منہج کا آغاز

دور قدیم میں فلسفے کا بنیادی موضوع تھا ''وجود اور اس کے ملحقات'' جبکہ دور جدید میں ''معرفت اور اس کے متعلقات'' اس کا بنیادی موضوع قرار پائے۔ یہ سلسلہ ڈیکارٹ سے شروع ہوتا ہے۔ البتہ اسلامی فلسفے میں وجود ذہنی، علم النفس الفلسفی اور عقل و عاقل و معقول وغیرہ کے ابواب میں پراگندہ طور پر اس موضوع پر بحث موجود رہی ہے۔ جدید اور انقلابی دور سے گزرتے ہوئے یورپ میں صورت حال مختلف تھی شک کی آندھی نے وہاں اُن طبیعی علوم کو تبدیل کر دیا جن کی بنیادیں ارسطوئی اور بطلیموسی نظام فکر پر استوار تھیں۔ وہاں انسان شناسی میں بھی نظر ثانی کی ضرورت پڑ گئی انیسویں صدی سے عالم اسلام میں مغربی اثر و نفوذ کے باوجود اسلامی علم کلام کو اپنے افکار کے لئے تشکیل نو کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ عالم اسلام اس وقت ان حالات سے نہیں گزر رہا تھا جس سے یورپ گزر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جمال الدین افغانی نے ''الرد علی الدھریین'' میں، شیخ محمد عبدہ نے ''رسالۃ التوحید'' میں اور اُن کے بعد علامہ طباطبائی اور شہید مطہری تک نے جو ذرائع اختیار کئے اُن میں معرفت کے اعتبار سے کوئی اہم بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اسی سبب سے علم اصول فقہ میں نص کی مرجعیت بھی باقی رہی اور دوسری طرف فلسفی فکر کی صورتوں میں صدر المتالہین اور اُن کے پیروکاروں میں ارسطوئی منطق کی مرجعیت بھی باقی رہی۔ بہرحال شہید صدر اور مذکورہ بالا شخصیات کی روش میں ایک فرق موجود ہے۔ اُن کے نزدیک عام فکری منطق، خصوصاً کلامی منطق عملی، فلسفی اور عملیاتی بنیاد پر تھی۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ کلامی روش فکر میں جوہری اور بنیادی تبدیلی واقع ہو چکی ہے تو اس سے ان کی یہی مراد ہے۔ صدر اور دیگر دانشوروں جن میں طباطبائی، مطہری اور ان کی فکر کے آج کے وارث شیخ عبداللہ جوادی آملی اور شیخ محمد تقی مصباح یزدی وغیرہ شامل ہیں، اُن کے مابین امتیازی نقطہ یہی ہے۔ انھوں نے معرفت کے موضوع کو کلاسیکی عقلی فلسفی روش کے تحت لیا ہے اور اُن کے فلسفے کی بنیادی بحث اثبات وجود واجب الوجود ہے جبکہ شہید صدر نے مسئلہ معرفت کو اپنا بنیادی موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں ایک فرق ان دو مکاتب فکر میں یہ بھی ہے کہ شہید مطہری وغیرہ کے نزدیک مسئلہ معرفت بنفسہ کلامی موضوع نہیں ہے، سوائے بعض ایسے نکات کے جو وجودِ واجب کے مذکرین کی بحث سے متعلق ہیں۔ بہرحال شہید صدر نے اپنی کتاب ''فلسفتنا'' میں دنیا کی مادی مارکسی تفسیر پر تنقید کی ہے۔ اس میں انھوں نے نظریہ معرفت اور مسئلہ ادراک وغیرہ کو اپنا موضوع بحث قرار دیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ''موجز اصول الدین'' ہے اس میں مختصر طور پر انھوں نے تجربی، وضعی اور جدلی مسائل کا حل کیا ہے۔

> شہید مطہری وغیرہ کے نزدیک مسئلہ معرفت بنفسہ کلامی موضوع نہیں ہے، سوائے بعض ایسے نکات کے جو وجودِ واجب کے مذکرین کی بحث سے متعلق ہیں۔

۲. نظریہ معرفت

شہید محمد باقر الصدر کو جدید اور مخصوص نظریہ معرفت کی بنیاد رکھنے والا منفرد اسلامی مفکر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نظریہ معرفت میں کلاسیکی ارسطوئی روش سے قدم باہر نکالا۔ قدیم ارسطوئی روش کی بنیاد چند قبل عقلی مفروضوں پر قائم ہے جن سے عقلی نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم بدیہیات عقلیہ اولیہ ہیں جنکی ایک مثال اجتماع نقیضین کا محال ہونا ہے۔ اسی طرح شہید صدر نے منہج تجربی سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ حس، تجربہ اور مشاہدہ کو معرفت کے لئے فقط ایک محدود اساس قرار دیتے ہیں۔

سید صدر کے تجربے میں نہایت قابل توجہ نقطہ منطق استقراء کے بارے میں اُنکے نظریے کا ہے۔ انھوں نے منطق ارسطوئی اور

منطق تجربی سے اپنا ایک خاص نظریہ تیار کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب ''الاسس المنطقية الاستقراء'' کا چوتھائی حصہ ان دونوں پر تنقید کیلئے مختص کیا ہے۔ انھوں نے خاص سے عام تک پہنچنے کے استقرائی طریقے میں موجود خامی کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً الف حرارت سے پھیل گیا۔ اسی طرح دیکھا گیا کہ ب، ج اور د بھی حرارت سے پھیل گئے۔ یہاں سے قاعدہ نکالا گیا کہ ہر چیز حرارت سے پھیلتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے یہ نتیجہ کیسے حاصل کیا جبکہ تمام گرم چیزیں ہمارے استقرا میں نہیں آئیں لہٰذا شہید صدر کہتے ہیں کہ جو نتیجہ ہم نے اخذ کیا ہے وہ ہمارے استقراء سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

اس مشکل کا حل صدر نے تجویز کیا ہے جس کا نام انھوں نے ''المذهب الذاتي للمعرفة'' رکھا ہے۔ اس کے دو مرحلے ہیں۔ پہلے مرحلے کو وہ ''التوالد الموضوعي'' کہتے ہیں جبکہ دوسرے مرحلے کو ''التوالد الذاتي'' نام دیتے ہیں۔ صدر کی رائے میں پہلا مرحلہ دوسرے پر مقدم ہے اور اس کی ممکنہ انتہا پر دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ''التوالد الموضوعي'' کا انحصار ریاضی کے احتمال اور فرض کے نظریے پر ہے۔ اس طریقے سے صدر ایک یقین تک پہنچتے ہیں۔ البتہ جو ''یقین'' صدر بیان کرتے ہیں وہ ارسطوئی برہانی یقین نہیں اور نہ وہ ریاضیاتی یقین ہے جو کسی قضیہ کے علم سے حاصل ہوتا ہے یا جو کسی قضیہ کے برعکس کے محال ہونے سے پیدا ہوتا ہے بلکہ صدر کا مقصد اس یقین سے ''یقینِ موضوعی'' ہے کہ جو اُسے یقین ذاتی سے جدا کرتا ہے تاہم بعد ازاں صدر نے عکس قضیہ کے محال کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لی تھی۔

شہید صدر کے فکری مراحل سے قطع نظر انھوں نے معرفت کے بارے میں اپنے نظریے کو علم کلام، اصول فقہ، فقہ، حدیث اور رجال جیسے علوم میں بھی جاری کیا ہے۔ لہٰذا اجماع، شہرت، تواتر اور سیرت کی اصولی بحثوں میں انھوں نے عقلائی اور متشرع کی جو تقسیم کی ہے وہ اپنے استقرائی نظریے کے مطابق ہی کی ہے۔

۳. سائنس اور مذہب کا تضاد

دین و فلسفہ کے مابین اختلاف یا تعلق کا مسئلہ گذشتہ صدیوں میں زیر بحث رہا ہے، فلسفے کے حوالے سے طویل و شدید بحث رہی ہے۔ اس کی مثال امام ابوحامد غزالی کی ''تهافت الفلاسفه'' ہے۔ فلسفے کی مخالفت بھی ہوئی جبکہ ابن رشد جیسے علماء نے عقل و نص کے مابین مصالحت کا راستہ اپنایا۔ یہی طریقہ صدرالدین شیرازی اور ملا ہادی سبزواری نے بھی اختیار کیا۔ فکری معرکے اشاعرہ و معتزلہ اور پھر اہل حدیث و اعتزال کے مابین جاری رہے۔ جب یورپ میں تبدیلی کا عمل شروع ہوا اور طبیعی علوم نے ترقی کی تو دین اور سائنس کے مابین معارضے کی بات شروع ہوئی۔

دین کے معترضین مادہ پرستوں اور میکانیاتی مفکرین کے نزدیک یہ اختلاف عملی حوالے سے تھا۔ انھوں نے خاص طور پر کلیسا کے نظریات کی بنیاد پر علوم طبیعی اور علوم دینی کے مابین شدید اختلاف کا ذکر کیا۔ اس موقع پر ضرورت تھی کہ دین کا نقطہ نظر کائنات کے بارے میں ایک خارجی حقیقت کے حوالے سے بیان کیا جائے۔ ایسی فضا میں سید محمد باقر صدر کا دور شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے عقائدی منہج اور جدید سائنسی منہج کے مابین شدید قربت پر زور دیا۔ صدر سائنس اور دین کے مابین تناقض کے قدیم نظریے کو بہت حد تک تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے اعتقادی مسائل کا بیان بھی جدید سائنسی منہج سے متاثر اور ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔

سید محمد حسین فضل اللہ کا کلامی تجربہ

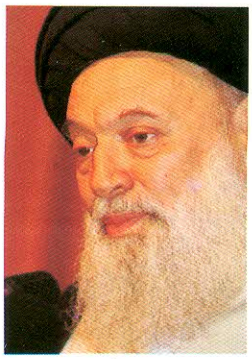

سید محمد حسین فضل اللہ

اس تجربے کی تفصیل میں جانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اولاً یہ ایک بہت واضح تجربے کے طور پر سامنے آیا ہے، ثانیاً اس کے بارے میں مسلسل شدید جدل واختلاف کا سلسلہ رہا ہے اور ثالثاً اس کے دو پہلو ہیں ایک سیاسی اور دوسرا ثقافتی۔

یہ تجربہ ڈاکٹر سروش کے تجربے سے کئی اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود دو مماثلتیں رکھتا ہے، ایک اس کی زبان کا ادبی ہونا اور دوسرا مختلف اسباب کی بنا پر اس کے خلاف شور وغل کا برپا ہونا۔ ڈاکٹر سروش فارسی ادب و جمالیات سے استفادہ کرتے ہیں اور سید فضل اللہ خود شاعر ہیں اور اُن کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جہاں تک ان دونوں تجربوں کے خلاف وسیع جدل کا تعلق ہے اُس کی بنیاد اُن کے ہاں استعمال ہونے والے مختلف الفاظ اور زیر بحث آنے والے موضوعات ہیں، مثلاً: معرفت دینی کا تکامل، عصمت، رجعت، پلورلزم، علم معصوم، ولایت تکوینی، احیائے دین، دین اور آئیڈیالوجی اور نص دینی کا فہم وغیرہ۔ بہر حال سید محمد حسین فضل اللہ کے تجربۂ کلامی کی چند بنیادی خصوصیات ہیں جن کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ علم کلام کی خصوصی یا عوامی حیثیت یا انفرادی عقل کی آزادی

جدید علم کلام کو ایک سخت اور حقیقی مشکل درپیش ہے۔ ایک جہت سے یہ مشکل عقل عام اور عقل خاص کے بارے میں اس کے موقف کے اعتبار سے ہے اور دوسری جہت سے خاص لوگوں کے لئے علم کلام کے اختصاص پر اس کے موقف کے لحاظ سے ہے۔ معروف معتزلی نقطہ نظر یہ تھا کہ ہر فرد کے لئے ضروری ہے کہ اُس کا خاص یقین اطمینان بخش دلائل پر قائم ہو۔ یہی شیعہ موقف بھی ہے، جس کے مطابق اعتقادی مسائل میں تقلید نہیں ہے جب تک کہ وہ ذاتی اطمینان کیلئے نتیجہ خیز نہ ہو۔

''الذخیرة فی علم الکلام'' میں شریف مرتضی نے اور ''الندوہ'' میں سید محمد حسین فضل اللہ نے یہی رائے اختیار کی ہے۔ لہٰذا علم کلام میں سید فضل اللہ نے خاص اور معین طبقوں کو مخاطب قرار نہیں دیا۔ انھوں نے جدید وسائل مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ کو بھی استعمال کیا اور منبر سے بھی استفادہ کیا۔ اُن کی رائے میں پہلے درجے پر یہ علم عوامی ہے نہ کہ خصوصی اور منتخب افراد کا۔ یہیں سے ہم خاص شخص کی عقل اور ایک عام فرد کی عقل کے موضوع پر سید فضل اللہ نے جو نتیجہ اخذ کیا اُس کی واضح اور منطقی صورت جان سکتے ہیں۔ عصری کلام کو اس صورت حال میں جس بنیادی مشکل کا سامنا ہے اُس کی وجہ سے یہ علم آج اپنے ظہور کی ابتدائی شکل میں باقی نہیں رہا۔ یہی صورت حال تمام علوم اسلامی کو درپیش ہے۔ اس کے مطابق کہا جا رہا ہے کہ معارف دینی کی علمی شکل بعد میں ظاہر ہوئی۔ توحید، نبوت، آخرت اور دیگر عقائد نے جنھیں اسلام لے کر آیا، بعد میں خبر کی صورت اختیار کر لی لہٰذا عقیدے کا عقیدتی مرحلہ اس کے علمی مرحلے سے مقدم اور مختلف ہے۔ علامہ فضل اللہ کے منہج کے تجزیے کیلئے ہمیں اسی پہلو کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۲۔ علمی میدان میں جرأت اظہار

بظاہر ہر علم کی تاریخ میں اونچ نیچ واقع ہوتی رہی ہے۔ اس کے مالی، معاشرتی، مفاداتی یا دیگر کئی اسباب ہو سکتے ہیں تاہم دین کا معاملہ چونکہ بہت حساس ہے اس لئے اس کے حوالے سے کسی قسم کی تبدیلی محسوس ہو تو اس کی طرف بہت توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس کے باوجود دین کی علمی صورتوں اور افکار میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ اگر ہم حق پسند ہوں تو علمی حوالے سے اور خاص طور پر علم کلام کے بارے میں ایسے کسی مظہر کی ہمیں ملامت نہیں کرنا چاہیے اور یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ علم کلام کی حیثیت علم طب، جدید فزکس یا معلوماتی علوم کی سی نہیں جن پر معروضی یا میدانی حالات کوئی اثر نہیں ڈالتے۔

دینی حوالے سے اور خاص طور پر علم کلام کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اس کے ظاہر کا بہت بڑا حصہ تاریخ کے ظاہر سے

جڑا ہوا ہے۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ تاریخ کو اس سے جدا کر دیں۔ ہم حضرت محمدؐ کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں۔ کیا یہ بات حقیقت نہیں کہ وہ تاریخ کے ایک خاص دور میں موجود تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے سولی دیے جانے کا معاملہ بھی تاریخ سے وابستہ ہے۔ دینی عقل وفکر سے تاریخ کو عام طور پر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جب دینی عقل کی تاریخ کی حدود میں توسیع کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے تجربہ نبوی سے لے کر صحابہؓ پھر تابعین یا آئمہؑ اور پھر فقہا وعلماء متقدمین کے تجربے تک توسیع دی جائے۔ اسے تاریخ کی حدود کے اندر تک لے جایا جائے اور تاریخ کی حدود کے تقدس اور قیمت کا قائل نہ ہو اجائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ عقل وفکر کی حریت کا مقدمہ بن جائے گا۔ یہی راستہ ہے جو جدید علم کلام میں کسی حد تک سید محمد حسین فضل اللہ نے اختیار کیا ہے انھوں نے نفس اور معرفت کے راستے سے یہ رکاوٹ ہٹا دی ہے۔ انھوں نے بارہا اس امر پر زور دیا ہے کہ ماضی کوئی تقدس اور فوقیت نہیں رکھتا۔ اپنے اسی نظریے کی وجہ سے انھوں نے بہت سے رائج شیعہ نظریات سے ہٹ کر نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔ مثلاً اپنی تفسیر "من وحی القرآن" میں انھوں نے نظریہ ولایت کے بارے میں مختلف رائے اختیار کی ہے۔ انھوں نے انبیاء کے آباء کے بارے میں معروف شیعی فکر سے ہٹ کر اظہار نظر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا مقالہ "مع الشیخ المفید فی تصحیح الاعتقاد" دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ سورہ عبس نبی کریمؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ شیعوں کے نزدیک یہ ایک نہایت حساس معاملہ ہے۔ علم معصوم سے متعلق بھی اُن کا نظریہ رائج شیعی فکر سے مختلف ہے۔ انھوں نے انبیاء وآئمہ کے بشری پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں عقائد کے علاوہ فقہ میں بھی بہت سی مثالیں ہیں، مثلاً وہ مردوں کے لئے داڑھی منڈوانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ فتویٰ ان کی کتاب "المسائل الفقهیه" اور "دنیا الشباب" میں موجود ہے۔ اسی طرح وہ زوجہ کے جنسی حق کے حوالے سے چار ماہ کی مدت کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے حق کو مرد کے حق کی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ ان کی کتاب "دنیا المرأة" میں موجود ہے۔

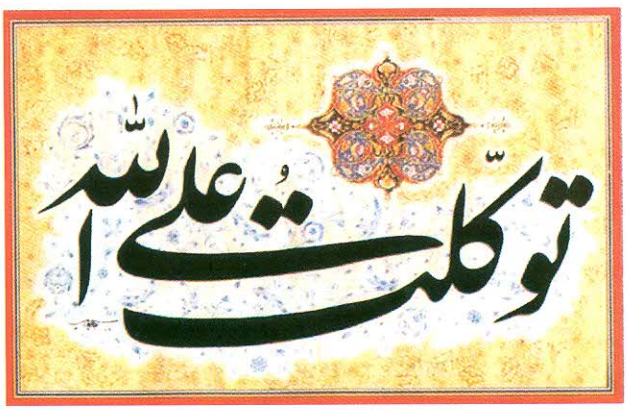

۳- کلامی نصوص کے مطالعے کا طریقہ

عام طور پر فقیہ کا طرز عمل فقہی روایات سے استفادہ کے حوالے سے متکلم اور فلسفی سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسفی کو قواعد عقلی سے سروکار ہوتا ہے جس میں تخصیص کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ فقیہ کے نزدیک نصوص میں تخصیص وتقیید کی بہت گنجائش ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی نص فلسفی مطالب کی حامل ہو تو فلسفی کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے قواعد عقلی سے ہم آہنگ کر لے۔ واعظ بھی نص سے بسہولت استفادہ کر لیتا ہے اور گاہے نص کی حدود سے باہر بھی نکل جاتا ہے کیونکہ اُس کا مقصد اخلاقی تربیت اور وعظ کرنا ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر عصر حاضر کے متکلمین کا طرز عمل نص کے حوالے سے دو طرح کا ہے۔ سید محمد باقر الصدر، ڈاکٹر عبدالکریم سروش اور شیخ محمد مجتہد شبستری کلامی موضوعات میں نص سے زیادہ استفادہ نہیں کرتے جبکہ علامہ طباطبائی اور سید فضل اللہ ان کی نسبت نص سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ علامہ طباطبائی کلامی موضوعات میں اگرچہ احکام عقلی وفلسفی کو مقدم رکھتے ہیں تاہم قرآن وحدیث میں موجود دینی فلسفی روایات کے اثرات ان کے ہاں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں تک سید فضل اللہ کا تعلق ہے تفسیر ہو یا علم کلام یا پھر خطاب ہر جگہ وہ نصوص سے استفادہ کرتے ہیں۔ البتہ ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ کلامی نصوص کے فہم عرفی پر زور دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصِ کلامی کی تاویل روحِ عرفی کے مطابق کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ اس تطبیق میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔ سید فضل اللہ کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ

وہ نص کو قبول کریں یا نہ کریں اُس پر بحث ضرور کرتے ہیں۔

جدید علم کلام

حالات بدلے، دنیا کے تقاضے تبدیل ہوئے اور تہذیب وثقافت تک میں تبدیلی آئی تو ہم نے دیکھا کہ دینی علم کلام کی اولیات وترجیحات تک بدل گئیں۔ موضوعات کی ترتیب تبدیل ہوگئی۔ پہلے ایک تبدیلی نویں صدی ہجری میں صفوی دور کے شروع ہونے سے بھی آئی تھی۔ سیاست کی تبدیلی نے فقہ واصول کو بھی متاثر کیا۔ پھر گذشتہ دو صدیوں میں دنیا میں ایک اور بڑی تبدیلی رونما ہوئی جو جدید علم کلام کے ظہور کا باعث بنی۔ نئے ادارے بنے، سیمیناروں میں نئے موضوعات زیر بحث آنے لگے۔ کلامی میراث کی تصحیح کا عمل شروع ہوا۔ مخطوطات کی اشاعت ہونے لگی۔ جدید وقدیم کلامی معارف آج انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی دنیا میں موجود ہیں۔ لہٰذا بحث کا دائرہ بھی اسی حساب سے پھیل گیا۔ آج کلامی مجلّات شائع ہورہے ہیں۔ کلامی اصطلاحات کی لغتیں چھپ رہی ہیں۔ ان معارف کے مجموعے اور دائرۃ المعارف تک مرتب ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں دینی مراکز ومدارس کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ علم کلام کو اپنے تدریسی نظام میں بنیادی جگہ دیں۔ علم معرفت، علم نفس، ہرمینوٹک، معاشرتی علوم، زبان شناسی اور تاریخ العلوم جیسے موضوعات کو ان دینی مراکز میں مناسب مقام ملنا چاہیے۔

علم کلام کے حوالے سے تبدیلی کا ایک دور نصیر الدین طوسی کے زمانے میں آیا۔ ان سے ماقبل عقائدی مسائل کو نص سے مطابقت دینے کی روش پر زیادہ زور تھا۔ انھوں نے اسے فلسفی مزاج سے ہم آہنگ کردیا۔ فلسفۃ الکلام کا موضوع وہیں سے شروع ہوا۔ البتہ علم کلام فلسفے کی طرح کوئی بالکل جدا علم نہیں بلکہ ایک دینی علم ہے لہٰذا نص سے اس کے تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جدید علم کلام کے عنوان کے بارے میں بھی متکلمین کے مابین بحث موجود ہے۔ اس عنوان کا آغاز شبلی نعمانی (۱۲۷۴-۱۳۳۲ھ) سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اسی زمانے میں مصر، شام اور دیگر ممالک میں بھی یہ عنوان استعمال کیا گیا۔ شہید مرتضیٰ مطہری نے خاص طور پر اس اصطلاح کو پیش کیا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد یہ تہران یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہوگیا اور پھر یہ حوزہ علمیہ قم میں بھی ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کرگیا۔ ڈاکٹر حسن حنفی نے بھی اپنی کتاب "الشامل" میں "علم اصول الدین الجدید" کی اصطلاح استعمال کی۔ اس سب کے باوجود شیخ عبداللہ جوادی آملی جدید وقدیم کے سابقے کو علم کلام کے ساتھ درست نہیں سمجھتے جبکہ احمد فرامرز قراملکی اور محمد اسفندیاری جیسے اساتذہ نے ان اصطلاحوں کا دفاع کیا ہے۔ بہرحال اب یہ موضوع چونکہ علمی مجالس وکتب میں چل پڑا ہے اس لئے واپسی کا کوئی امکان نہیں رہا۔

اصل سوال یہ ہے کہ کیا علم کلام کے منہج ومعرفت میں کوئی بنیادی تبدیلی آئی ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضرور آئی ہے۔ بہت سی پرانی بحثیں آج متروک ہوگئی ہیں۔ آج سیاست، معاشرت اور علم النفس کے موضوعات کلام کے بنیادی موضوعات بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ فقہ، اخلاق، فلسفہ اور علوم طبیعی جیسے علوم کے اثرات بھی علم کلام پر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں لہٰذا علم کلام جدید ایک موضوعی وخارجی حقیقت کی صورت اختیار کرچکا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ضروری ہے کہ قدیم کلامی تجربے کو بھی سامنے رکھا جائے۔ اس میں قوت وضعف دونوں کے عناصر موجود ہیں۔ قدیم متکلمین کے ہاں گہرائی اور جامعیت دکھائی دیتی ہے جبکہ جدید علم کلام میں گہرے غور وخوض کے بغیر فوری رائے

دینے کا طرز عمل دکھائی دیتا ہے۔ متکلمین کو چاہیے کہ وہ مغربی تحقیقات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں۔ اسی طرح عالم عرب اور ایران وغیرہ میں جو کام اس سلسلے میں ہوا ہے اس کا بھی گہری نظر سے جائزہ لیں۔ یہ طریقہ درست نہیں کہ ادھر کوئی نظریہ سنا یا ادھر کوئی کتاب دیکھی اور فوراً اس کی رد یا تائید میں کھڑے ہو گئے ہیں۔

البتہ قدیم وجدید کلام کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں علم کلام دینی معرفت کے اپنے خاندان کے دیگر افراد مثلاً فلسفہ بلکہ فقہ واخلاق تک سے بے گانہ ہو گیا۔ متکلمین نے کوششیں تو بہت کیں لیکن بہت سی بے سود تھیں۔ عقل فرضی کی طرح طرح کی صورتیں اور طرح طرح کے احتمالات گھڑے جن کا خارج سے کوئی تعلق نہ تھا جبکہ آج کا علم کلام درپیش مسائل کی طرف متوجہ ہے اور نتیجہ بخش موضوعات اس کے پیش نظر ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا ذکر بطور مثال کیا جاتا ہے:

۱۔ دین کی حدود کیا ہیں۔ کیا یہ فرد اور اخلاقیات تک محدود ہے یا سیاست، اقتصادیات یہاں تک کہ طب بھی اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔

۲۔ کیا دین کی زبان حکایت کی زبان ہے یا قصے کی یا حقیقت کی یا پھر کوئی اور؟

۳۔ کیا دین ایک فطری حقیقت ہے یا پھر یہ جہل، خوف یا طبقاتی تقسیم کی پیداوار ہے؟

۴۔ دینی واخلاقی تجربے میں کیا فرق ہے۔ دینی تجربے کے محفوظ رہنے کا معیار کیا ہے۔ دینی، روحانی اور عرفانی تجربے میں کیا فرق ہے؟

۵۔ دینی قضایا عقلی طریقے سے ثابت ہوتے ہیں یا شہودی طریقے سے۔ تعقل وتعبد کے مابین کیا رابطہ ہے؟

۶۔ دین کی کیا تعریف ہے؟ دین وغیر دین میں حد فاصل کیا ہے۔

۷۔ دین کا عنصر ذاتی کیا ہے اور عنصر عرضی کیا ہے۔ یعنی دین کا جوہر کیا ہے اور عرض کیا ہے۔ دینی امور کی ترجیحات کیا ہیں۔ یعنی اخلاق، قانون، عقیدہ وغیرہ کی دینی اہمیت کے لحاظ سے کیا ترتیب ہے؟

۸۔ دینی معرفت کا منہج کیا ہے۔ کیا یہ عقلی ترکیبی ہے تفکیکی ہے یا نقلی تجربی ہے یا سلوکی ہے یا شہودی یا بعض کی باہمی آمیزش؟

۹۔ کیا سارے ادیان صحیح ہیں۔ درستی غیر درستی میں کیا نسبت ہے؟

۱۰۔ ادیان ومذاہب کے امتیازات کیا ہیں۔ ان کے درمیان واضح حدود کیا ہیں؟

۱۱۔ فرد اور اجتماع پر دین کیا اثر مرتب کرتا ہے؟

۱۲۔ دینی معاشرے کی خصوصیات کیا ہیں۔ دینی وغیر دینی معاشرے کے امتیازات اور افتراقات کیا ہیں؟

۱۳۔ دینی وانسانی معرفت کے اشتراک کی حدود اور ارتباط کی اقسام کیا ہیں؟

۱۴۔ دین میں کونسی چیز متغیر ہے اور کون سی ثابت؟

۱۵۔ دین اور سائنس کے مابین تعلق کا مسئلہ کلام جدید کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔

۱۶۔ دینی کا اخلاقی نظریہ کیا ہے؟

۱۷۔ کیا دین انسانی ہے یا غیر انسانی؟ انسانی حقوق، آزادی اور عدالت کی دینی لحاظ سے کیا حیثیت ہے؟

۱۸۔ دین اور آئیڈیالوجی میں کیا رابطہ اور کیا نسبت ہے؟

۱۹۔ تقلیدی کلامی بحثوں میں مفہوم یا حقیقت کا تعین، ان میں روح، جن، شیطان، باری تعالیٰ، وحی، معجزہ، ملائکہ، امامت، مہدویت، حسن، قبح، آدم، خلافت الٰہیہ وغیرہ جیسے مفاہیم شامل ہیں۔

علم کلام کے حوالے سے تبدیلی کا ایک دور نصیر الدین طوسی کے زمانے میں آیا۔ ان سے ماقبل عقائدی مسائل کو نص سے مطابقت دینے کی روش پر زیادہ زور تھا